نوعیت مسئلہ

انسانی تمدن کے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلے دو ہیں، جنکے صحیح اور متوازن حل پر انسان کی فلاح و ترقی کا انحصار ہے اور جنکو حل کرنے میں قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک دنیا کے حکما و عقلا پریشان و سرگرداں رہے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں عورت اور مرد کا تعلق کس طرح قائم کیا جائے، کیونکہ یہی تعلق دراصل تمدن کا سنگِ بنیاد ہے، اور اسکی نزاکت کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں ذرا سی بھی کجی آجائے تو

تا ثریا می رود دیوار کج

اور دوسرا مسئلہ فرد اور جماعت کے تعلق کا ہے جس کا تناسب قائم کرنے میں اگر ذرا سی بے اعتدالی بھی باقی رہ جائے تو صدیوں تک عالم انسانی کو اسکے تلخ نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔

ایک طرف ان دونوں مسائل کی اہمیت کا یہ حال ہے، اور دوسری طرف انکی پیچیدگی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک فطرت کے تمام حقائق پر کسی کی نظر پوری طرح حاوی نہ ہو وہ انکو حل نہیں کر سکتا۔ سچ کہا تھا جس نے کہا تھا کہ انسان ایک عالم اصغر ہے۔ اُس کے جسم کی ساخت، اُسکے نفس کی ترکیب، اُس کی قوتیں اور قابلیتیں، اُسکی خواہشات، ضروریات اور جذبات و احساسات، اور اپنے وجود سے باہر کی بیشمار اشیاء کے ساتھ اسکے فعلی اور انفعالی تعلقات، یہ سب چیزیں ایک دنیا کی دنیا اپنے اندر رکھتی ہیں۔ انسان کو پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ اس دنیا کا ایک ایک گوشہ نگاہ کے سامنے روشن نہ ہو جائے اور انسان کی زندگی کے بنیادی مسائل حل نہیں کیے جا سکتے جب تک کہ خود انسان کو پوری طرح سمجھ نہ لیا جائے

یہی وہ پیچیدگی ہے جو عقل و حکمت کی ساری کاوشوں کا مقابلہ ابتدا سے کر رہی ہے اور آج تک کیے جا رہی ہے۔ اول تو اس دنیا کے تمام حقائق ابھی تک انسان پر کھلے ہی نہیں ہیں۔ انسانی علوم میں سے کوئی علم بھی ایسا نہیں جو کمال کے آخری مرتبہ پر پہنچ چکا ہو، یعنی جسکے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہو کہ جتنی حقیقتیں اس شعبۂ علم سے تعلق رکھتی ہیں ان سب کا اس نے احاطہ کر لیا ہے۔ مگر جو حقائق روشنی میں آچکے ہیں انکی وسعتوں اور باریکیوں کا بھی یہ عالم ہے کہ کسی انسان کی، بلکہ انسانوں کے کسی گروہ کی نظر بھی اُن سب پر بیک وقت حاوی نہیں ہوتی۔ ایک پہلو سامنے آتا ہے اور دوسرا پہلو نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔ کہیں نظر کوتاہی کرتی ہے اور کہیں شخصی رجحانات حجاب نظر بن جاتے ہیں۔ اس دوہری کمزوری کی وجہ سے انسان خود اپنی زندگی کے اِن مسائل کو حل کرنے کی جتنی تدبیریں بھی کرتا ہے وہ ناکام ہوتی ہیں اور تجربہ آخر کار اُنکے نقص کو نمایاں کر دیتا ہے۔ صحیح حل صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ نقطۂ عدل کو پا لیا جائے، اور نقطۂ عدل پایا نہیں جا سکتا جب تک کہ تمام حقائق نہ سہی، کم از کم معلوم حقائق ہی کے سارے پہلو یکساں طور پر نگاہ کے سامنے نہ ہوں۔ مگر جہاں منظر کی وسعت بجائے خود اتنی زیادہ ہو کہ بینائی اس پر چھا نہ سکے، اور اسکے ساتھ نفس کی خواہشات اور رغبت و نفرت کے میلانات کا یہ زور ہو کہ جو چیزیں صاف نظر آتی ہوں انکی طرف سے بھی خود بخود نگاہ پھر جائے، وہاں نقطۂ عدل کس طرح مل سکتا ہے؟ وہاں تو جو حل بھی ہوگا اس میں لامحالہ یا افراط پائی جائیگی یا تفریط۔

اوپر جن دو مسائل کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں سے صرف پہلا مسئلہ اس وقت ہمارے سامنے زیر بحث ہے۔ اس باب میں جب ہم تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو افراط اور تفریط کی کھینچ تان کا ایک عجیب سلسلہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت جو ماں کی حیثیت سے آدمی کو جنم دیتی اور بیوی کی حیثیت سے زندگی کے ہر نشیب و فراز میں مرد کی رفیق رہتی ہے، خادمہ بلکہ لونڈی کے مرتبے میں رکھ دی گئی ہے، اس کو بیچا اور خریدا جاتا ہے، اُسکو ملکیت اور وراثت کے تمام حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے،

اُس کو گناہ اور نجاست اور ذلت کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کی شخصیت کو اُبھرنے اور نشوونما پانے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ دوسری طرف ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ وہی عورت اٹھائی اور ابھاری جا رہی ہے مگر اس شان سے کہ اُسکے ساتھ بداخلاقی اور بدنظمی کا ایک طوفان بھی اٹھ رہا ہے، وہ حیوانی خواہشات کا کھلونا بنائی جاتی ہے، اسکو واقعی شیطان کی ایجنٹ بنا کر رکھدیا جاتا ہے، اور اسکے ابھرنے کے ساتھ انسانیت کے گرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان دونوں انتہاؤں کو ہم محض نظری حیثیت ہی سے افراط اور تفریط کے ناموں سے موسوم نہیں کرتے بلکہ تجربہ جب اُنکے مُضر نتائج کا پورا ریکارڈ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیتا ہے تب ہم اخلاق کی زبان میں ایک انتہا کو افراط اور دوسری کو تفریط کہتے ہیں۔ تاریخ کا یہی منظر جسکی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، ہم کو یہ بھی دکھاتا ہے کہ جب ایک قوم وحشت کے دور سے نکل کر تہذیب و حضارت کی طرف بڑھتی ہے تو اسکی عورتیں لونڈیوں اور خدمتگاروں کی حیثیت سے اسکے مردوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ابتدا میں بدویانہ طاقتوں کا زور اسے آگے بڑھائے لیے جاتا ہے، مگر تمدنی ترقی کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے پورے نصف حصہ کو پستی کی حالت میں رکھ کر وہ آگے نہیں جا سکتی۔ اس کو اپنی ترقی کی رفتار رکتی نظر آتی ہے اور ضرورت کا احساس اسے مجبور کرتا ہے کہ اس نصف ثانی کو بھی نصف اول کے ساتھ چلنے کے قابل بنائے۔ مگر جب وہ اس نقصان کی تلافی شروع کرتی ہے تو صرف تلافی پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ عورت کی آزادی سے خاندانی نظام (جو تمدن کی بنیاد ہے) منہدم ہو جاتا ہے، عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے، شہوانیت اور عیش پرستی پوری قوم کے اخلاق کو تباہ کر دیتی ہے، اور اخلاقی تنزل کے ساتھ ساتھ ذہنی، جسمانی اور مادّی قوتوں کا تنزل بھی لازمی طور پر رونما ہوتا ہے جس کا آخری انجام ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ تاریخ سے اسکی مثالیں زیادہ تفصیل کے ساتھ دی جا سکیں

مگر توضیح مدعا کے لیے دو چار مثالیں ناگزیر ہیں۔

یونان اقوام قدیمہ میں سے جس قوم کی تہذیب سب سے زیادہ شاندار نظر آتی ہے وہ اہل یونان ہیں۔ اس قوم کے ابتدائی دور میں اخلاقی نظریہ، قانونی حقوق، اور معاشرتی برتاؤ ہر اعتبار سے عورت کی حیثیت بہت گری ہوئی تھی۔ یونانی خرافیات (Mythology) میں ایک خیالی عورت پانڈورا (Pandora) کو اسی طرح تمام انسانی مصائب کا موجب قرار دیا گیا تھا جس طرح یہودی خرافیات میں حضرت حوا علیہا السلام کو قرار دیا گیا ہے۔ حضرت حوا کے متعلق اس غلط افسانے کی شہرت نے عورت کے بارے میں یہودی اور مسیحی اقوام کے رویہ پر جو زبردست اثر ڈالا ہے اور قانون، معاشرت، اخلاق، ہر چیز کو جس طرح متاثر کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ قریب قریب ایسا ہی اثر پانڈورا کے توہم کا یونانی ذہن پر بھی ہوا تھا۔ انکی نگاہ میں عورت ایک ادنیٰ درجہ کی مخلوق تھی۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اسکا مرتبہ گرا ہوا رکھا گیا تھا، اور عزت کا ہر مقام مرد کے لیے مخصوص تھا۔

تمدنی ارتقار کے ابتدائی مراحل میں یہ طرز عمل تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ برقرار رہا۔ تہذیب اور علم کی روشنی کا صرف اتنا اثر ہوا کہ عورت کا قانونی مرتبہ توجوں کا توں رہا، البتہ معاشرت میں اسکو نسبتہً ایک بلند تر حیثیت دیدی گئی۔ وہ یونانی گھر کی ملکہ تھی۔ اسکے فرائض کا دائرہ گھر تک محدود تھا اور ان حدود میں وہ پوری طرح با اقتدار تھی۔ اُسکی عصمت ایک قیمتی چیز تھی جس کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ شریف یونانیوں کے ہاں پردے کا رواج تھا۔ انکے گھروں میں زنانخانے مردانخانوں سے الگ ہوتے تھے۔ انکی عورتیں مخلوط محفلوں میں شریک نہ ہوتی تھیں، نہ منظرِ عام پر نمایاں کی جاتی تھیں۔ نکاح کے ذریعہ سے کسی ایک مرد کے ساتھ وابستہ ہونا عورت کے لیے شرافت کا مرتبہ تھا اور اسی کی عزت تھی، اور بیسوا بن کر رہنا اسکے لیے ذلت کا موجب سمجھا جاتا تھا۔ یہ اس زمانہ کا حال تھا جب یونانی قوم خوب طاقتور تھی اور پورے زور کے ساتھ عروج و ترقی کی طرف جا رہی تھی۔ اس دور میں اخلاقی خرابیاں ضرور موجود

تھیں مگر ایک حد کے اندر تھیں۔ یونانی عورتوں سے اخلاق کی جس پاکیزگی اور طہارت و عصمت کا مطالبہ کیا جاتا تھا اس سے مرد مستثنیٰ تھے۔ اُن سے نہ اس کا مطالبہ تھا اور نہ اخلاقاً کسی مرد سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ پاک زندگی بسر کریگا۔ بیسوا طبقہ یونانی معاشرت کا ایک غیر منفک جزء تھا، اور اس طبقہ سے تعلق رکھنا مردوں کے لیے کسی طرح معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ اہل یونان پر نفس پرستی اور شہوانیت کا غلبہ شروع ہوا اور اس دور میں بیسوا طبقہ کو وہ عروج نصیب ہوا جسکی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ رنڈی کا کوٹھا یونانی سوسائیٹی کے ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ طبقوں تک ہر ایک کا مرکز و مرجع بنا ہوا تھا۔ فلاسفہ، شعرا، مورخین، اہل ادب اور ماہرین فنون، غرض تمام سیارے اسی آفتاب کے گرد گھومتے تھے۔ وہ نہ صرف علم و ادب کی محفلوں کی صدر نشین تھی، بلکہ بڑے بڑے سیاسی معاملات بھی اسی کے حضور میں طے ہوتے تھے۔ قوم کی زندگی و موت کا فیصلہ جن مسائل کے ساتھ وابستہ تھا ان میں اُس عورت کی رائے وقیع سمجھی جاتی تھی جسکی دو راتیں بھی کسی ایک شخص کے ساتھ وفاداری میں بسر نہ ہوتی تھیں۔ یونانیوں کے ذوق جمال اور حسن پرستی نے ان کے اندر شہوانیت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکایا۔ وہ اپنے اس ذوق کا اظہار جن مجسموں (یا مے آرٹ کے عریاں نمونوں) میں کرتے تھے وہی انکی شہوانیت کو اور زیادہ ہوا دیتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ اُنکے ذہن سے یہ تصور ہی محو ہو گیا تھا کہ شہوت پرستی بھی کوئی اخلاقی عیب ہے۔ ان کا معیار اخلاق اتنا بدل گیا تھا کہ بڑے بڑے فلاسفہ اور معلمین اخلاق بھی زنا اور فحش میں کوئی قباحت اور کوئی چیز قابل ملامت نہ پاتے تھے۔ عام طور پر یونانی لوگ نکاح کو ایک غیر ضروری رسم سمجھنے لگے تھے اور نکاح کے بغیر عورت اور مرد کا تعلق بالکل معقول سمجھا جاتا تھا جسکو کسی سے چھپانے کی ضرورت نہ تھی۔ آخر کار ان کے مذہب نے بھی ان کی حیوانی خواہشات کے آگے سپر ڈال دی۔ "کام دیوی" (Aphrodite) کی پرستش تمام یونان میں پھیل گئی جسکی داستان انکے خرافیات میں یہ تھی کہ ایک دیوتا کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے تین

مزید دیوتاؤں سے آشنائی کر رکھی تھی، اور انکے ماسوا ایک فانی انسان کو بھی اسکی جناب میں سرفرازی کا فخر حاصل تھا۔ اسی کے بطن سے محبت کا دیوتا کیوپڈ پیدا ہوا جو اِن دیوی صاحبہ اور انکے ایک غیر قانونی دوست کی باہمی لگاوٹ کا نتیجہ تھا۔ یہ اُس قوم کی معبودہ تھی، اور اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو قوم ایسے کیرکٹر کو نہ صرف مثال (آئیڈیل) بلکہ معبودیت تک کا درجہ دے دے اسکے معیار اخلاق کی پستی کا کیا عالم ہوگا۔ یہ اخلاقی انحطاط کا وہ مرتبہ ہے جس میں گرنے کے بعد کوئی قوم پھر کبھی نہ ابھر سکی۔ ہندوستان میں بام مارگ اور ایران میں مزدکیت کا ظہور اسی انحطاط کے دور میں ہوا۔ بابل میں بھی قحبہ گری کو مذہبی تقدس کا درجہ اسی زمانہ میں حاصل ہوا جس کے بعد پھر دنیا نے کبھی بابل کا نام افسانۂ ماضی کے سوا کسی دوسری حیثیت سے نہ سُنا۔ یونان میں جب کام دیوی کی پرستش شروع ہوئی تو قحبہ خانہ عبادت گاہ میں تبدیل ہوگیا۔ فاحشہ عورتیں دیوداسیاں بن گئیں اور زنا ترقی کرکے ایک مقدس مذہبی فعل کے مرتبہ تک پہنچ گئی۔

اسی شہوت پرستی کا ایک دوسرا مظہر یہ تھا کہ یونانی قوم میں عملِ قومِ لوط ایک وبا کی طرح پھیلا اور مذہب واخلاق نے اسکا بھی خیر مقدم کیا۔ ہومر اور ہیشیوڈ کے عہد میں اس فعل کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ مگر تمدن کی ترقی نے جب آرٹ اور ذوقِ جمال (Æsthetic taste) کے مہذب ناموں سے عریانی اور لذات نفس کی بندگی کو سراہنا شروع کیا تو شہوانی جذبات کا اشتعال بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا کہ فطرت کے راستہ سے تجاوز کرکے یونانیوں کو خلافِ وضع فطرت طریقہ میں تسکین کی جستجو کرنی پڑی۔ آرٹ کے ماہروں نے اس جذبہ کو مجسموں میں نمایاں کیا۔ معلمین اخلاق نے اس کو دو شخصوں کے درمیان "دوستی کا مضبوط رشتہ" قرار دیا۔ سب سے پہلے دو یونانی انسان جو اس قدر کے مستحق سمجھے گئے کہ انکے اہل وطن انکے مجسمے بناکر انکی یاد تازہ رکھیں وہ ہرموڈیس اور ارسٹوگیٹن تھے جنکے درمیان غیر فطری محبت کا تعلق تھا۔

تاریخ کی شہادت تو یہی ہے کہ اس دور کے بعد یونانی قوم کو زندگی کا کوئی دوسرا دور پھر نصیب نہیں ہوا۔

روم | یونانیوں کے بعد جس قوم کو دنیا میں عروج نصیب ہوا وہ اہلِ روم تھے۔ یہاں پھر وہی اتار چڑھاؤ کا مرقع ہمارے سامنے آتا ہے جو اوپر آپ دیکھ چکے ہیں۔ رومی لوگ وحشت کی تاریکی سے نکل کر جب تاریخ کے روشن منظر پر نمودار ہوتے ہیں تو انکے نظام معاشرت کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ مرد اپنے خاندان کا سردار ہے۔ اسکو اپنی بیوی بچوں پر پورے حقوق مالکانہ حاصل ہیں۔ بلکہ بعض حالات میں بیوی کو قتل کر دینے کا بھی مجاز ہے۔

جب وحشت کم ہوئی اور تمدن و تہذیب میں رومیوں کا قدم آگے بڑھا تو اگرچہ قدیم خاندانی نظام بدستور قائم رہا مگر عملاً اس کی سختیوں میں کچھ کمی واقع ہوئی اور ایک حد تک اعتدالی حالت پیدا ہوتی گئی۔ رومی جمہوریت کے زمانۂ عروج میں یونان کی طرح پردے کا رواج تو نہ تھا، مگر عورت اور جوان نسل کو خاندانی نظام کے مضبوط شکنجہ میں کس کر رکھا گیا تھا۔ عصمت و عفت، خصوصاً عورت کے معاملہ میں ایک قیمتی چیز تھی اور اسکو معیارِ شرافت سمجھا جاتا تھا۔ اخلاق کا معیار کافی بلند تھا۔ ایک مرتبہ رومی سینیٹ کے ایک ممبر نے اپنی بیٹی کے سامنے اپنی بیوی کا بوسہ لے لیا تو اسکو قومی اخلاق کی سخت توہین سمجھا گیا اور سینیٹ میں اس پر ملامت کا ووٹ پاس کیا گیا۔ عورت اور مرد کے تعلق کی جائز اور شریفانہ صورت نکاح کے سوا کوئی دوسری نہ تھی۔ ایک عورت اسی وقت عزت کی مستحق ہو سکتی تھی جبکہ وہ ایک خاندان کی ماں (Matron) ہو۔ بیسوا طبقہ اگرچہ موجود تھا، اور مردوں کو ایک حد تک اس طبقہ سے ربط رکھنے کی آزادی تھی، مگر عام رومیوں کی نگاہ میں اسکی حیثیت نہایت ذلیل تھی، اور اس سے تعلق رکھنے والے مردوں کو بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا۔

تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اہل روم کا نظریہ عورت کے بارے میں بدلتا چلا گیا، اور رفتہ رفتہ نکاح و طلاق کے قوانین اور خاندانی نظام کی ترکیب میں اتنا تغیر رونما ہوا کہ صورتِ حال سابق حالات کے بالکل برعکس ہو گئی۔ نکاح محض ایک قانونی معاہدہ (Civil Contract) بن کر رہ گیا جس

کا قیام و بقاء فریقین کی رضامندی پر منحصر تھا۔ ازدواجی تعلق کی ذمہ داریوں کو بہت ہلکا سمجھا جانے لگا۔ عورت کو وراثت اور ملکیت مال کے پورے حقوق دیدیے گئے اور قانون نے اسکو باپ اور شوہر کے اقتدار سے بالکل آزاد کر دیا۔ رومی عورتیں معاشی حیثیت سے نہ صرف خود مختار ہوگئیں بلکہ قومی دولت کا ایک بڑا حصہ بتدریج ان کے حیطۂ اختیار میں چلا گیا۔ وہ اپنے شوہروں کو بھاری شرح سود پر قرض دیتی تھیں، اور مالدار عورتوں کے شوہر عملاً انکے غلام بن کر رہ جاتے تھے۔ طلاق کی آسانیاں اس قدر بڑھیں کہ بات بات پر ازدواج کا رشتہ توڑا جانے لگا۔ مشہور رومی فلسفی و مدبر سنیکا (۴ ق م - ۶۵ء) سختی کے ساتھ رومیوں کی کثرت طلاق پر ماتم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اب روم میں طلاق کوئی بڑی شرم کے قابل چیز نہیں رہی، عورتیں اب اپنی عمر کا حساب اپنے شوہروں کی تعداد سے لگاتی ہیں"۔ اس دور میں ایک ایک عورت یکے بعد دیگرے کئی کئی شادیاں کرتی چلی جاتی تھی۔ مارشل (۴۳ء - ۱۰۴ء) ایک عورت کا ذکر کرتا ہے جو دس خاوند کر چکی تھی۔ جُووِینل (۶۰ء - ۱۴۰ء) ایک عورت کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے پانچ سال میں آٹھ شوہر بدلے۔ سینٹ جروم (۳۴۰ء - ۴۲۰ء) ان سب سے زیادہ ایک باکمال عورت کا حال لکھتا ہے جس نے آخری بار تیئیسواں شوہر کیا تھا اور اپنے شوہر کی بھی وہ اکیسویں بیوی تھی۔

اس دور میں عورت اور مرد کے غیر نکاحی تعلق کو معیوب سمجھنے کا خیال بھی دلوں سے نکلتا چلا گیا یہاں تک کہ بڑے بڑے معلمین اخلاق بھی زنا کو ایک معمولی چیز سمجھنے لگے۔ کاٹو (Cato) جس کو ۱۸۴ ق م میں روم کا محتسب اخلاق مقرر کیا گیا تھا صریح طور پر جوانی کی آوارگی کو حق بجانب ٹھیراتا ہے۔ سِسِرو جیسا شخص جوانوں کے لیے اخلاق کے بند ڈھیلے کرنے کی سفارش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ایکٹیٹس (Epictetus) جو فلاسفۂ رواقیین (Stoics) میں بہت ہی سخت اخلاقی اصول رکھنے والا سمجھا جاتا تھا، اپنے شاگردوں کو ہدایت کرتا ہے کہ "جہاں تک ہو سکے شادی سے پہلے عورت کی صحبت سے اجتناب کرو مگر جو اس معاملہ میں ضبط نہ رکھ سکیں انہیں ملامت بھی نہ کرو۔"

اخلاق اور معاشرت کے بند جب اتنے ڈھیلے ہو گئے تو روم میں شہوانیت، عریانی اور فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ تھیٹروں میں بے حیائی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لیے ضروری ہو گئیں۔ قحبہ گری کے کاروبار کو وہ فروغ نصیب ہوا کہ قیصر ٹائبیریس (۱۴ تا ۳۷ء) کے عہد میں معزز خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لیے ایک قانون نافذ کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ فلورا (Flora) نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے برسرِ عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی اس دور میں عام تھا۔ رومی لٹریچر میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان کیے جاتے تھے اور عوام وخواص میں وہی ادب مقبول ہوتا تھا جس میں استعارہ و کنایہ تک کا پردہ نہ رکھا گیا ہو۔

بہیمی خواہشات سے اس قدر مغلوب ہو جانے کے بعد روم کا قصرِ عظمت ایسا پیوندِ خاک ہوا کہ پھر اسکی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔

مسیحی یورپ مغربی دنیا کے اس اخلاقی انحطاط کا علاج کرنے کے لیے مسیحیت پہنچی اور اول اول اس نے بڑی اچھی خدمات انجام دیں۔ فواحش کا انسداد کیا۔ عریانی کو زندگی کے ہر شعبہ سے نکالا۔ قحبہ گری کو بند کرنے کی تدبیریں کیں۔ طوائف اور مغنیہ اور رقاصہ عورتوں کو انکے پیشہ سے توبہ کرائی۔ اور پاکیزہ اخلاقی تصورات لوگوں میں پیدا کیے۔ مگر عورت اور صنفی تعلقات کے بارے میں آبائے مسیحیین جو نظریات رکھتے تھے وہ انتہا پسندی کی بھی انتہا تھے، اور ساتھ ہی فطرت انسانی کے خلاف اعلانِ جنگ بھی۔ ان کا ابتدائی اور بنیادی نظریہ یہ تھا کہ عورت گناہ کی ماں اور بدی کی جڑ ہے۔ مرد کے لیے معصیت کی تحریک کا سرچشمہ اور جہنم کا دروازہ ہے۔ تمام انسانی مصائب کا آغاز اُسی سے ہوا ہے۔ اُس کا عورت ہونا ہی اسکے شرمناک ہونے کے لیے کافی ہے۔ اسکو اپنے حُسن و جمال پر شرمانا چاہیے کیونکہ وہ شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اسکو دائماً کفارہ ادا کرتے رہنا چاہیے کیونکہ وہ دنیا اور دنیا والوں پر

لعنت اور مصیبت لائی ہے۔ ترتولیان (Tertullian) جو ابتدائی دور کے ائمۂ مسیحیت میں سے تھا عورت کے متعلق مسیحی تصور کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:

"وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے۔ وہ شجر ممنوع کی طرف لیجانے والی، خدائی قانون کو توڑنے والی اور خدا کی تصویر ــــ مرد کو غارت کرنے والی ہے۔"

کرائی سوسٹم (Chrysostom) جو مسیحیت کے اولیائے کبار میں شمار کیا جاتا ہے، عورت کے حق میں کہتا ہے:

"ایک ناگزیر برائی، ایک پیدائشی وسوسہ، ایک مرغوب آفت، ایک خانگی خطرہ، ایک خانگی دلربائی اور ایک آراستہ مصیبت۔"

ان کا دوسرا نظریہ یہ تھا کہ عورت اور مرد کا صنفی تعلق بجائے خود ایک نجاست اور قابل احتراز چیز ہے، خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اخلاق کا یہ راہبانہ تصور پہلے سے اشراقی فلسفہ (Neo-Platonism) کے زیر اثر مغرب میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ مسیحیت نے آکر اسے حد کو پہنچا دیا۔ اب تجرد اور دوشیزگی معیار اخلاق قرار پائی اور تأہل کی زندگی اخلاقی اعتبار سے پست اور ذلیل سمجھی جانے لگی۔ لوگ ازدواج سے پرہیز کرنے کو تقویٰ اور تقدس اور بلندی اخلاق کی علامت سمجھنے لگے۔ پاک مذہبی زندگی بسر کرنے کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ یا تو آدمی نکاح ہی نہ کرے، یا اگر نکاح کر لیا ہو تو میاں اور بیوی ایک دوسرے سے زن و شو کا تعلق نہ رکھیں۔ متعدد مذہبی مجلسوں میں یہ قوانین مقرر کیے گئے کہ چرچ کے عہدہ دار تخلیہ میں اپنی بیویوں سے نہ ملیں، میاں اور بیوی کی ملاقات ہمیشہ کھلی جگہ میں ہو اور کم از کم دو غیر آدمی وہاں موجود ہوں۔ ازدواجی تعلق کے نجس ہونے کا تخیل طرح طرح سے مسیحیوں کے دل میں بٹھایا جاتا تھا۔ مثلاً ایک قاعدہ یہ تھا کہ جس روز چرچ کا کوئی تہوار ہو اس سے پہلے کی رات جن میاں بیوی نے یکجا گذاری ہو وہ تہوار میں شریک نہیں ہو سکتے۔ گویا انہوں نے کسی گناہ کا ارتکاب

کیا ہے جس سے آلودہ ہونے کے بعد وہ کسی مقدس مذہبی کام میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہے ! اس راہبانہ تصور نے تمام خاندانی علائق، حتی کہ ماں اور بیٹے تک کے تعلق میں بھی تلخی پیدا کردی، اور ہر وہ رشتہ گندگی اور گناہ بن کر رہ گیا جو نکاح کا نتیجہ ہو۔

ان دونوں نظریات نے نہ صرف اخلاق اور معاشرت میں عورت کی حیثیت حد سے زیادہ گرادی بلکہ تمدنی قوانین کو بھی اس درجہ متاثر کیا کہ ایک طرف ازدواجی زندگی مردوں اور عورتوں کے لیے مصیبت بن کر رہ گئی اور دوسری طرف سوسائیٹی میں عورت کا مرتبہ ہر حیثیت سے پست ہوگیا۔ مسیحی شریعت کے زیر اثر جتنے قوانین مغربی دنیا میں جاری ہوئے ان سب کی مشترک خصوصیات یہ تھیں :

(۱) معاشی حیثیت سے عورت کو بالکل بے بس کر کے مرد کے قابو میں دیدیا گیا۔ وراثت میں اس کے حقوق نہایت محدود تھے اور ملکیت میں اس سے بھی زیادہ۔ وہ خود اپنی محنت کی کمائی پر بھی اختیار نہ رکھتی تھی بلکہ اسکی ہر چیز کا مالک اس کا شوہر تھا۔

(۲) طلاق اور خلع کی سرے سے اجازت ہی نہ تھی۔ زوجین میں خواہ کتنی ہی ناموافقت ہو، باہمی تعلقات کی خرابی سے خواہ گھر نمونۂ جہنم ہی بن گیا ہو، مذہب اور قانون دونوں انکو زبردستی ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ بعض انتہائی شدید حالات میں زیادہ سے زیادہ جو تدارک ممکن تھا وہ صرف یہ تھا کہ زوجین میں تفریق (Separation) کرادی جائے، یعنی وہ ایک دوسرے سے بس الگ کردیے جائیں۔ الگ ہو کر نکاح ثانی کرنے کا حق نہ عورت کو تھا نہ مرد کو۔ درحقیقت یہ تدارک پہلی صورت سے بھی بدتر تھا کیونکہ اس کے بعد ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو وہ دونوں راہب اور راہبہ بن جائیں، یا پھر تمام عمر بدکاری کرتے رہیں۔

(۳) شوہر کے مرنے کی صورت میں بیوی کے لیے اور بیوی کے مرنے کی صورت میں شوہر کے لیے نکاح ثانی کرنا سخت معیوب بلکہ گناہ قرار دیا گیا تھا۔ مسیحی علما کہتے تھے کہ یہ محض حیوانی خواہشات کی بندگی

اور ہوس رانی ہے۔ انکی زبان میں اس فعل کا نام "مہذب زناکاری" تھا۔ چرچ کے قانون میں مذہبی عہدہ داروں کے لیے نکاح ثانی کرنا جرم تھا۔ عام ملکی قوانین میں بعض جگہ اسکی سرے سے اجازت ہی نہ تھی، اور جہاں قانون اجازت دیتا تھا وہاں بھی رائے عام، جو مذہبی تصورات کے زیر اثر تھی، اس کو جائز نہ رکھتی تھی۔

جدید یورپ | اٹھارویں صدی عیسوی میں یورپ کے فلاسفہ اور اہل قلم نے جب سوسائیٹی کے خلاف فرد کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھائی اور شخصی آزادی کا صور پھونکا تو ان کے سامنے وہی غلط نظام تمدن تھا جو مسیحی نظام اخلاق و فلسفۂ زندگی اور نظام جاگیرداری (Feudal System) کے مخلوس اتحاد سے پیدا ہوا تھا اور جس نے انسانی روح کو غیر فطری زنجیروں میں جکڑ کر ترقی کے سارے دروازے بند کر رکھے تھے۔ اس نظام کو توڑ کر ایک نیا نظام بنانے کے لیے جو نظریات جدید یورپ کے معماروں نے پیش کیے اُنکے نتیجہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا اور اسکے بعد مغربی تہذیب و تمدن کی رفتار ترقی اُن راستوں پر لگ گئی جن پر بڑھتے بڑھتے وہ آج کی منزل پر پہنچی ہے۔

اس جدید دور کے آغاز میں صنف اناث کو پستی سے اٹھانے کے لیے جو کچھ کیا گیا، اجتماعی زندگی پر اس کے خوشگوار نتائج مترتب ہوئے۔ نکاح و طلاق کے پچھلے قوانین کی سختی کم کی گئی۔ عورتوں کے معاشی حقوق، جو بالکل سلب کر لیے گئے تھے، بڑی حد تک انہیں واپس دیے گئے۔ اُن اخلاقی نظریات کی اصلاح کی گئی جنکی بنا پر عورت کو ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا۔ معاشرت کے اُن اصولوں میں ترمیم کر دی گئی جنکی وجہ سے عورت فی الواقع لونڈی بن کر رہ گئی تھی۔ اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کے دروازے مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی کھولے گئے۔ ان مختلف تدبیروں سے رفتہ رفتہ عورتوں کی وہ قابلیتیں جو غلط قوانین معاشرت اور جاہلانہ اخلاقی تصورات کے بھاری بوجھوں تلے دبی ہوئی تھیں ابھر آئیں۔ انہوں نے گھروں کو سنوارا۔ معاشرت میں نفاست پیدا کی۔ رفاہ عام کے بہت سے مفید کام کیے صحت

عامہ کی ترقی، نئی نسلوں کی عمدہ تربیت، بیماروں کی خدمت، اور فنونِ خانہ داری کا نشوونما، یہ سب کچھ اس بیداری کے ابتدائی پھل تھے جو تہذیبِ نو کی بدولت عورتوں میں رونما ہوئی۔ لیکن جن نظریات کے بطن سے یہ نئی تحریک اٹھی تھی ان میں ابتدا ہی سے افراط کا میلان موجود تھا۔ انیسویں صدی میں اس میلان نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی، اور بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مغربی معاشرت بے اعتدالی کی دوسری انتہا پر پہنچ گئی۔

یہ نظریات جن پر نئی مغربی معاشرت کی بنا رکھی گئی ہے، تین عنوانات کے تحت آتے ہیں:

(۱) عورتوں اور مردوں کی مساوات۔

(۲) عورتوں کا معاشی استقلال (Economic independence)

(۳) دونوں صنفوں کا آزادانہ اختلاط۔

ان تین بنیادوں پر معاشرت کی تعمیر کرنے کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا بالآخر وہی ظاہر ہوا۔

(۱) مساوات کے معنی یہ سمجھ لیے گئے کہ عورت اور مرد نہ صرف اخلاقی مرتبہ اور انسانی حقوق میں مساوی ہوں، بلکہ تمدنی زندگی میں عورت بھی وہی کام کرے جو مرد کرتے ہیں، اور اخلاقی بندشیں عورت کے لیے بھی اسی طرح ڈھیلی کر دی جائیں جس طرح مرد کے لیے پہلے سے ڈھیلی ہیں۔ مساوات کے اس غلط تخیل نے عورت کو اسکے اُن فطری وظائف سے غافل اور منحرف کر دیا جن کی بجاآوری پر تمدن کے بقاء، بلکہ نوعِ انسانی کے بقاء کا انحصار ہے۔ معاشی، سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں نے اسکی شخصیت کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا۔ انتخابات کی جدوجہد، دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت، آزاد تجارتی و صنعتی پیشوں میں مردوں کے ساتھ مقابلہ، کھیلوں اور ورزشوں کی دوڑ دھوپ، سوسائیٹی کے تفریحی مشاغل میں شرکت، کلب اور اسٹیج اور رقص و سرود کی مصروفیتیں، یہ اور ان کے سوا اور بہت سی ناکردنی و ناگفتنی چیزیں اس پر کچھ اس طرح چھا گئیں کہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں، بچوں کی تربیت، خاندان کی خدمت،

گھر کی تنظیم، ساری چیزیں اسکے لائحۂ عمل سے خارج ہو کر رہ گئیں، بلکہ ذہنی طور پر وہ اِن مشاغل ــــ اپنے اصلی فطری مشاغل ــــ سے متنفر ہو گئی۔ اب مغرب میں خاندان کا نظام، جو تمدن کا سنگِ بنیاد ہے، بری طرح منتشر ہو رہا ہے۔ گھر کی زندگی، جسکے سکون پر انسان کی قوت کارکردگی کے نشو و نما کا انحصار ہے، عملاً ختم ہو رہی ہے۔ نکاح کا رشتہ، جو تمدن کی خدمت میں عورت اور مرد کے تعاون کی صحیح صورت ہے، تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہو گیا ہے۔ نسلوں کی افزائش کو برتھ کنٹرول اور اسقاط حمل اور قتل اولاد کے ذریعہ سے روکا جا رہا ہے۔ اخلاقی مساوات کے غلط تخیل نے عورتوں اور مردوں کے درمیان بد اخلاقی میں مساوات قائم کر دی ہے۔ وہ بے حیائیاں جو کبھی مردوں کے لیے بھی شرمناک تھیں، اب وہ عورتوں تک کے لیے شرمناک نہیں رہیں۔

(۲) عورت کے معاشی استقلال نے اسکو مرد سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ قدیم اصول کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے، اب اس نئے قاعدہ سے بدل گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کمائیں اور گھر کا انتظام بازار کے سپرد کر دیا جائے۔ اس انقلاب کے بعد دونوں کی زندگی میں بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ایسا ربط باقی نہیں رہا جو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور کرتا ہو۔ اور ظاہر ہے کہ محض شہوانی خواہشات کو پورا کرنا کوئی ایسا کام نہیں ہے جسکی خاطر مرد اور عورت لامحالہ اپنے آپ کو ایک دائمی تعلق ہی کی گرہ میں باندھنے اور ایک گھر بنا کر مشترک زندگی ہی گذارنے پر مجبور ہوں۔ جو عورت اپنی روٹی آپ کماتی ہے، اپنی تمام ضروریات کی خود کفیل ہے، اپنی زندگی میں دوسرے کی حفاظت اور اعانت کی محتاج نہیں ہے، وہ آخر محض اپنی شہوانی خواہش کی تسکین کے لیے کیوں ایک مرد کی پابند ہو؟ کیوں اپنے اوپر بہت سی اخلاقی اور قانونی بندشیں عائد کرے؟ کیوں ایک خاندان کی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے؟ خصوصاً جبکہ اخلاقی مساوات کے تخیل نے اسکی راہ سے وہ تمام رکاوٹیں بھی دور کر دی ہوں جو اسے آزادانہ شہوت رانی کا طریقہ اختیار کرنے میں پیش آسکتی تھیں، تو وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے آسان اور پرلطف اور خوشنما راستہ

چھوڑ کر قربانیوں اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدا ہوا پرانا دقیانوسی (old fashioned) راستہ کیوں اختیار کرے؟ گناہ کا خیال مذہب کے ساتھ رخصت ہوا۔ سوسائیٹی کی ملامت کا خوف یوں دور ہو گیا کہ سوسائیٹی اب اسے فاحشہ ہونے پر ملامت نہیں کرتی بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ آخری خطرہ حرامی بچے کی پیدائش کا تھا، سو اس سے بچنے کے لیے منع حمل کے ذرائع موجود ہیں۔ ان ذرائع کے باوجود حمل قرار پا جائے تو اسقاط میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہو تو بچے کو خاموشی کے ساتھ قتل کیا جا سکتا ہے اور اگر کم بخت جذبۂ مادری نے (جو بدقسمتی سے ابھی بالکل فنا نہیں ہو سکا ہے!) بچے کو ہلاک کرنے سے روک بھی دیا تو حرامی بچے کی ماں بن جانے میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اب "کنواری ماں" اور "ناجائز مولود" کے حق میں اتنا پروپیگنڈا ہو چکا ہے کہ جو سوسائیٹی انکو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کی جرأت کریگی اسے خود تاریک خیالی کا الٹا الزام اپنے سر لینا پڑے گا۔

یہ وہ چیز ہے جس نے مغربی معاشرت کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ آج ہر ملک میں لاکھوں جوان عورتیں تجرد پسند ہیں جنکی زندگیاں آزاد شہوت رانی میں بسر ہو رہی ہیں۔ ان سے بہت زیادہ عورتیں ایسی ہیں جو عارضی جذباتِ محبت کے زور سے شادیاں کر لیتی ہیں، مگر چونکہ اب شہوانی تعلق کے سوا مرد اور عورت کے درمیان کوئی ایسا احتیاجی ربط باقی نہیں رہا ہے جو انہیں مستقل وابستگی پر مجبور کرتا ہو، اسلیے مناکحت کے رشتہ میں اب کوئی پائداری نہیں رہی۔ میاں اور بیوی جو ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز ہو چکے ہیں، آپس کے تعلقات میں کسی مراعات باہمی اور کسی مدارات (Compromise) کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ نری شہوانی محبت کے جذبات بہت جلدی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک ادنیٰ وجہ اختلاف، بلکہ بسا اوقات صرف سرد مہری ہی انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر نکاحوں کا انجام طلاق یا تفریق پر ہوتا ہے۔ منع حمل، اسقاط، قتل اولاد، شرح پیدائش کی کمی اور ناجائز ولادتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد بڑی حد تک اسی سبب کی رہینِ منت ہے۔ بدکاری، بے حیائی اور امراض خبیثہ کی ترقی میں بھی اس کیفیت کا

بڑا دخل ہے۔

(۳) مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط نے عورتوں میں حسن کی نمائش، عریانی اور فواحش کو غیر معمولی ترقی دیدی ہے۔ صنفی میلان (Soxual attraction) جو پہلے ہی فطری طور پر مرد اور عورت کے درمیان موجود ہے اور کافی طاقت ور ہے، دونوں صنفوں کے آزادانہ میل جول کی صورت میں بہت آسانی کے ساتھ غیر معمولی حد تک ترقی کر جاتا ہے۔ پھر اس قسم کی مخلوط سوسائیٹی میں قدرتی طور پر دونوں صنفوں کے اندر یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ صنف مقابل کے لیے زیادہ سے زیادہ جاذب نظر (Attractive) بنیں، اور جبکہ اخلاقی نظریات کے بدل جانے کی وجہ سے ایسا کرنا معیوب بھی نہ رہا ہو، بلکہ علانیہ شانِ دلربائی پیدا کرنے کو مستحسن سمجھا جانے لگا ہو، تو حُسن و جمال کی نمائش رفتہ رفتہ تمام حدود کو توڑتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ برہنگی کی آخری حد کو پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ یہی کیفیت اس وقت مغربی تہذیب میں پیدا ہو گئی ہے۔ صنف مقابل کے لیے مقناطیس بننے کی خواہش عورت میں اتنی بڑھ گئی ہے اور بڑھتی جا رہی ہے کہ شوخ و شنگ لباسوں، غازوں اور سرخیوں اور بناؤ سنگھار کے نت نئے سامانوں سے بھی اسکی تسکین نہیں ہوتی۔ بے چاری تنگ آکر اپنے کپڑوں سے باہر نکلی پڑتی ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات تار تک لگا نہیں رہنے دیتی۔ ادھر مردوں کی طرف سے ہر وقت ہل من مزید کا تقاضا ہے، کیونکہ جذبات میں جو آگ لگی ہوئی ہے وہ حُسن کی ہر بے حجابی پر بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے اور مزید بے حجابی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ان غریبوں کی پیاس بھی بڑھتے بڑھتے توتس بن گئی ہے، جیسے کسی کو لُو لگ گئی ہو اور پانی کا ہر گھونٹ پیاس کو بجھانے کے بجائے کچھ اور بھڑکا دیتا ہو۔ حد سے بڑھی ہوئی شہوانی پیاس سے بے تاب ہو کر بے چارے ہر وقت ہر ممکن طریقے سے اسکی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ ننگی تصویریں، یہ صنفی لٹریچر، یہ عشق و محبت کے افسانے، یہ عریاں اور جوڑواں ناچ، یہ جذبات شہوانی سے بھرے ہوئے فلم آخر کیا ہیں؟ سب اسی آگ کو بجھانے ــــ مگر دراصل بھڑکانے ــــ کے سامان ہیں جو اس غلط معاشرت نے

ہر سینے میں لگا رکھی ہے۔ اور اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے اس کا نام انہوں نے رکھا ہے "آرٹ"!

یہ گھُن بڑی تیزی کے ساتھ مغربی قوموں کی قوتِ حیات کو کھا رہا ہے۔ یہ گھُن لگنے کے بعد آج تک کوئی قوم نہیں بچی۔ یہ اُن تمام ذہنی اور جسمانی قوتوں کو کھا جاتا ہے جو قدرت نے انسان کو زندگی اور ترقی کے لیے عطا کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ ہر طرف سے شہوانی محرکات میں گھرے ہوئے ہوں، جنکے جذبات کو ہر آن ایک نئی تحریک اور ایک نئے اشتعال سے سابقہ پڑے، جن پر ایک سخت ہیجان انگیز ماحول پوری طرح چھا گیا ہو، جنکے خون کو عریاں تصویریں، فحش لٹریچر، ولولہ انگیز گانے، برانگیختہ کرنے والے ناچ، عشق و محبت کے فلم، دل چھیننے والے زندہ مناظر، اور صنفِ مقابل سے ہر وقت کی مڈبھیڑ کے مواقع بہم ایک جوش کی حالت میں رکھتے ہوں، وہ کہاں سے وہ امن، وہ سکون اور وہ اطمینان لا سکتے ہیں جو تعمیری اور تخلیقی کاموں کے لیے ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایسے ہیجانات کے درمیان اُن کو، اور خصوصاً اُنکی جوان نسلوں کو وہ ٹھنڈی اور پُرسکون فضا میسر ہی کہاں آسکتی ہے جو انکی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کے نشوونما کے لیے ناگزیر ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی تو بہیمی خواہشات کا دیو اُنکو دبوچ لیتا ہے۔ اس کے چنگل میں پھنس کر وہ بنسپ کیسے سکتے ہیں۔

فکرِ انسانی کی المناک ناکامی تین ہزار سال کے تاریخی نشیب و فراز کی یہ مسلسل داستان ایک بڑے خطۂ زمین سے تعلق رکھتی ہے جو پہلے بھی دو عظیم الشان تہذیبوں کا گہوارہ رہ چکا ہے، اور اب پھر جس کی تہذیب کا ڈنکا دنیا میں بج رہا ہے۔ ایسی ہی داستان مصر، بابل، ایران اور دوسرے ممالک کی بھی ہے۔ اور خود ہمارا ملک، ہندوستان بھی صدیوں سے اسی افراط و تفریط میں گرفتار ہے۔ ایک طرف عورت داسی بنائی جاتی ہے، مرد اسکی سوامی اور پتی دیو، یعنی مالک اور معبود بنتا ہے، اس کو بچپن میں باپ کی، جوانی میں شوہر کی اور بیوگی میں اولاد کی مملوکہ بن کر رہنا پڑتا ہے، اسے شوہر کی چتا پر بھینٹ چڑھایا جاتا ہے، اسکو ملکیت اور وراثت کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، اس پر نکاح کے انتہائی سخت قوانین مسلط کیے جاتے ہیں جنکے مطابق وہ اپنی رضا اور پسند کے بغیر ایک مرد کے حوالہ کی جاتی ہے اور پھر زندگی کے آخری سانس تک اُسکی ملکیت سے کسی حال میں نہیں نکل سکتی، اس کو

یہودیوں اور یونانیوں کی طرح گناہ اور اخلاقی و روحانی پستی کا مجسمہ سمجھا جاتا ہے، اور اسکی مستقل شخصیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جب اس پر مہر کی نگاہ ہوتی ہے تو اسے بہیمی خواہشات کا کھلونا بنا لیا جاتا ہے۔ وہ مرد کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے اور ایسی سوار ہوتی ہے کہ خود بھی ڈوبتی ہے اور اپنے ساتھ ساری قوم کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ لنگ اور یونی کی پوجا، یہ عبادت گاہوں میں برہنہ اور جوڑوں مجسمے، یہ دیوداسیاں (Religious prostitutes)، یہ ہولی کے کھیل، اور یہ دریاؤں کے نیم عریاں اشنان آخر کس چیز کی یادگار ہیں؟ اُس بام مارگی تحریک کے باقیات غیر صالحات ہی تو ہیں جو ایران، بابل، یونان اور روم کی طرح ہندوستان میں بھی تہذیب و تمدن کی انتہائی ترقی کے بعد وبا کی طرح پھیلی اور ہندو قوم کو صدیوں کے لیے تنزل و انحطاط کے گڑھے میں پھینک گئی۔

اس داستان کو غائر نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ عورت کے معاملہ میں نقطۂ عدل کو پانا، اور اسے سمجھنا اور اس پر قائم ہونا انسان کے لیے کس قدر دشوار ثابت ہوا ہے۔ نقطۂ عدل یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف عورت کو اپنی شخصیت اور اپنی قابلیتوں کے نشوونما کا پورا موقع ملے، اور اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صلاحیتوں کے ساتھ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ مگر دوسری طرف اس کو اخلاقی تنزل و انحطاط کا ذریعہ اور انسانی جماعت کی تباہی کا آلہ نہ بننے دیا جائے، بلکہ مرد کے ساتھ اسکے تعاون کی ایسی سبیل مقرر کر دی جائے کہ دونوں کا اشتراکِ عمل ہر حیثیت سے تمدن کے لیے صحت بخش ہو۔ اس نقطۂ عدل کو دنیا صدہا برس سے تلاش کرتی رہی ہے مگر آج تک نہیں پا سکی۔ کبھی ایک انتہا کی طرف جاتی ہے اور انسانیت کے پورے نصف حصہ کو بیکار بنا کر رکھ دیتی ہے۔ کبھی دوسری انتہا کی طرف جاتی ہے اور انسانیت کے دونوں حصوں کو ملا کر غرقِ مئے ناب کر دیتی ہے۔

نقطۂ عدل ناپید نہیں۔ موجود ہے۔ مگر ہزاروں سال افراط اور تفریط کے درمیان گردش کرتے رہنے کی وجہ سے لوگوں کا سر کچھ اتنا چکرا گیا ہے کہ وہ سامنے آتا ہے اور پہچان نہیں سکتے کہ یہی تو وہ مطلوب ہے

جسے ہماری فطرت ڈھونڈ رہی تھی۔ اس مطلوبِ حقیقی کو دیکھ کر وہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، اُس پر آوازے کستے ہیں، اور جسکے پاس وہ نظر آتا ہے اُلٹا اُسی کو شرمندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انکی مثال اس بچے کی سی ہے جو ایک کوئلے کی کان میں پیدا ہوا ہو اور وہیں جوانی کی عمر تک پہنچے۔ ظاہر ہے کہ اسکو وہی کوئلے کی ماری ہوئی آب ہوا اور وہی کالی کالی فضا ہی عین فطری چیز معلوم ہوگی۔ اور جب وہ اس کان سے نکال کر باہر لایا جائیگا تو عالم فطرت کی پاکیزہ فضا میں ہر شے کو دیکھ کر اول اول وہ ضرور اُبرائے گا۔ مگر انسان آخر انسان ہے۔ اسکی آنکھیں کوئلے کی چھت اور تاروں بھرے آسمان کا فرق محسوس کرنے سے کب تک انکار کر سکتی ہیں؟ اسکے پھیپھڑے گندی ہوا اور صاف ہوا میں آخر کب تک تمیز نہ کرینگے؟